ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

OPEN ACCESS

CC BY NC

فائزہ مظہر علوی
لیکچرار، اُردُو، اسلام آباد ماڈل کالج برائے طالبات، اسلام آباد
ڈاکٹر سید علی اصغر شاہ
اسسٹنٹ پروفیسر، کلر کہار سائنس کالج، کلر کہار (چکوال)
محمد ثاقب فاروق اعوان
پی ایچ ڈی اردو سکالر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف سندھ

قراۃ العین حیدر کے ناول "آخرِ شب کے ہمسفر" کا نو تاریخی مطالعہ

Faiza Mazhar Alvi *
Lecturer, Urdu, Islamabad Model College for Girls, Islamabad.
Dr.Syed Ali Asghar Shah
Assistant Professor, Kallar Kahar Science College, Kallar Kahar (Chakwal).
Muhammad Saqib Farooq Awan
PhD Urdu Scholar, Deptt; of Urdu University of Sindh

***Corresponding Authors:** faizamazharalvi@gmail.com

Neo-Historic Study of Qurat-ul-ain Haider's Novel ''Akhir-e-Shab kay Humsafar''

The beginning of modernism in Urdu literature was the end of 19th century. Modernism emerged as an ideology in social and literary life. This enlightenment project paved the way for the literary world to examine literature in different ways. Neo-historicism is one of these theories to examine literature in the light of history. It gives the special importance to the cultural element in understanding of literature. It sees not only the historical events in literature but also the cultural, political, language and social elements that drive it, expressed in literature. In this article theory of neo-historicism is

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

being implemented on Qurat-ul-ain Haider's Novel "Akhir-e-Shab kay Humsafar".

Key Words: *Historicism, Neo-Historicism, Modernism, literature, Culture, Bengal.*

اردو ادب میں جدیدیت کا آغاز انیسویں صدی کا اختتام تھا۔ جدیدیت ایک نظریے کے طور پر سماجی اور ادبی زندگی میں ظہور پذیر ہوئی۔ روشن خیالی کے اس پروجیکٹ نے ادبی دنیا میں ادب کو مختلف طریقوں سے پرکھنے کے راستے ہموار کیے۔ یہی روشن خیالی ادبی اصناف کے مندراجات کی شکل میں بھی نظر آرہی تھی۔ خاص طور پر افسانہ اور شاعری اس سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی نظریے کے تحت ادب کو تاریخ کے ضمن میں پرکھنے کا ایک طریقہء کار وضع کیا گیا۔ جو تاریخ کی روشنی میں ادب پارے کی تفہیم و تعبیر کرے۔ اس کو تاریخیت کا نام دیا گیا۔ تاریخیت باقاعدہ ایک تحریک کی شکل میں ادبی منظر نامے پر ابھری۔ تاریخیت میں ادب پر تاریخ کو ترجیح دی گئی اور ادب کا مطالعہ تاریخی اور سماجی تناظر میں کیا جانے لگا۔ اس ضمن میں بہت سے ادب پاروں کا مطالعہ کیا گیا۔ اور انھیں تاریخیت کے تحت پرکھا جانے لگا۔ اردو ادب کی تنقید میں بھی یہ روش دکھائی دینے لگی اور تاریخیت اور نو تاریخیت کے نظری مباحث میں، ڈاکٹر وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر اور عتیق اللہ کے علاوہ دیگر ناقدین کی مختلف آراء ملتی ہیں۔ یہ کام بھی زیادہ تر کتابوں میں مضامین کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ تاریخیت نے ادب میں جن تاریخی تضادات کو اجاگر نہیں کیا۔ اور ادب کو تاریخ کے زیر اثر سمجھا اور معاشی اور تاریخی واقعات کی تفہیم پر جس طرح زور دیا گیا، نو تاریخیت اس کے ردّ عمل میں مابعد جدید دور کے مظہر کے طور پر سامنے آئی۔ نو تاریخیت کو مابعد جدیدیت کا مظہر گردانا گیا۔ اسٹیفن گرین بلاٹ نے سب سے پہلے ۱۹۸۰ء میں اپنی کتاب "Self fashioning; from more to Renaissance Shakespeare" میں کہا ہے کہ تاریخ کے تحت ادب خود مختار نہیں ہو سکتا۔ تاریخیت کے تحت لکھنے والے ادباء اور ناقدین کو چاہیے کہ وہ اس پر دوبارہ غور و فکر کریں۔ ۱۹۸۸ء میں اس نے نو تاریخیت کی اصطلاح وضع کرتے ہوئے کہا کہ یہ نا تو کوئی تھیوری ہے اور نہ ہی کبھی ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نو تاریخیت بھی ادب کی تفہیم کا ایک طریقہء کار ہے۔ تاریخیت جس ادب کو خود مختار گردانتی ہے، نو تاریخیت اس تصور کو ردّ کرتی ہے۔ نو تاریخیت دراصّل تاریخیت کے مقابلے میں زیادہ وسیع پیمانے پر ادب کا مطالعہ مختلف زاویہ ہائے نظر سے کرنے کی متمنی ہے۔ وہ ادب کو تاریخ کے زیر اثر رکھنے کے خلاف ہے۔

اردو ادب میں مابعد جدیدیت کا آغاز ۱۹۷۰ء سے مانا جاتا ہے۔ اور اسی دوران پس ساختیات کا چرچا بھی شروع ہوا۔ جس نے ادب میں نئی تنقیدی روِش کا آغاز کیا۔ اسی کے تحت نو تاریخیت ان کمیوں کی نشاندہی کرتی ہے

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

جو تاریخیت کے ساختیاتی طریقہ ءکار میں رہ گئی تھیں۔ تاریخیت جہاں ادب میں داخلی اظہار کو ترجیح دیتی ہے اور خارج سے اس کے رشتے کو اہمیت نہیں دیتی اور ادب کو مکمل طور پر تاریخ کے حوالے کر دیتی ہے۔ اس کی تفہیم ماضی کے واقعات کے زیرِ اثر کرنے کی قائل ہے۔ چاہے وہ غیر جانبدار ہوں یا نہ ہوں۔ نو تاریخت اس کے برعکس ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کے مطابق

> "نئی تاریخیت ادب کو اس کے خارجی منظر نامے سے منسلک قرار دیتی ہے، مگر یہ ادب اور خارج یا تاریخ میں براہِ راست اور سیدھے سادے رشتے کی قائل ہر گز نہیں۔ اس کی رو سے ادب سماجی صورتِ حال اور تاریخی قوتوں کا صاف اور سچا عکس نہیں۔"(۱)

نو تاریخیت ادب کی تفہیم میں ثقافتی عنصر کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ یہ ادب میں صرف تاریخی واقعات کو نہیں بلکہ اس میں کار فرما ثقافتی، سیاسی اور سماجی عناصر کو بھی دیکھتی ہے۔ نو تاریخیت کا یہ ماننا ہے کہ ادب میں تاریخی و سماجی عناصر کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن ثقافت ایک ایسا عنصر ہے جو زبان کے حوالے سے بھی اپنی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ زبان اور ثقافت کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح تاریخیت میں متن اور موضوع کا جو فرق روا رکھا جاتا ہے۔ نو تاریخیت، تاریخیت کے اکہرے نظریات کی ترجمانی کے برعکس متن اور موضوع کے فرق کو ختم کرتی ہے اور ادب اور تاریخ دونوں کو متن اور ڈسکورس کا درجہ دیتی ہے۔ نو تاریخیت میں ثقافتی نظریے کے حوالے سے گوپی چند نارنگ کا یہ ماننا ہے کہ کوئی بھی ادب اپنی تاریخ اور کلچر سے باہر نہیں ہوتا۔ جہاں ادب تاریخ سے آزاد نہیں ہو سکتا وہیں وہ اپنی ثقافت یا کلچر کا نمائندہ بھی ہوتا ہے۔

نو تاریخیت ثقافت اور ادب کے گہرے رشتے کی تفہیم کا بھی ایک طریقہ ہے۔ اس حوالے سے نو تاریخیت اور مشل فوکو کے تاریخی تصورات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ فوکو کے مطابق انسانی تہذیب میں ثقافت ایک خاص عنصر ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں نئے عناصر کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی فکر بھی ایک نقطے پر مرکوز نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح ثقافت انسانی فکر اور انسانی فکر ثقافتی ارتقاء کا بھی احاطہ کرتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے مطابق تاریخ کا تصور کچھ اس طرح ہے کہ یہ عدم تسلسل کا شکار ہے۔ چوں کہ تاریخ بدلتی رہتی ہے اور ایک ہی دور میں ایک ہی تاریخ لکھنے والوں کے ہاں بھی اس کا بیان مختلف تضادات کا حامل نظر آتا ہے۔ ایک ہی واقعہ مختلف مندراجات کے تحت بیان ہوتا ہے۔ اس لیے اس ضرورت کو پیش نظر رکھا گیا کہ تاریخی

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

متن کو دوبارہ سے لکھا جانا چاہیے۔ نو تاریخیت بھی اسی عدم تسلسل اور مختلف وقتوں کی حامل تاریخ کے تحت کسی بھی عہد کے متن کا مطالعہ اس طرح کرتی ہے کہ اس متن کو اسی دور کے کسی دوسرے متن کے مقابل رکھ کر بھی پرکھتی ہے۔ اور اس میں مضمر پوشیدہ بیانیوں اور تاریخی تضادات کو اجاگر کرتی نظر آتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اسے قراءت کا خاص طریقہ کہا ہے جو متن کے عمیق مطالعہ پر زور دیتا ہے۔

عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جس فن پارے میں تاریخیت کے عناصر موجود ہوں اس میں نو تاریخی عناصر بھی ہوں گے۔ یعنی ایک ہی فن پارے کا تاریخیت اور نو تاریخیت دونوں تناظر میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن تاریخیت صرف تاریخ اور مارکسی نقطہ نظر کے تحت فن پارے کا مطالعہ کرتی ہے اور نو تاریخیت ثقافتی ،سیاسی، سماجی اور دیگر مضمر بیانیوں کو تاریخی تضادات کے ہمراہ بیان کرتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر متن کا دونوں طریقے سے مطالعہ کیا جاسکے۔ کیونکہ دونوں طریقہء کار کے عناصر کا کہ جن کی بناء پر تاریخیت یا نو تاریخیت کے تحت مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان عناصر کا متن میں ہونا ضروری ہے۔ عین ممکن ہے کہ کوئی متن تاریخیت نے تناظر میں اہم ہو، مگر اس میں نو تاریخیت کے نظریے کے عناصر اس نہج پر کار فرمانہ ہو کہ ان کا نو تاریخیت کے تحت مطالعہ کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیسے تاریخ کو طاقتور عناصر کے زیر اثر تسلیم کیا جاتا ہے اور ان طاقتوں کے بعد تاریخ میں ردّوبدل بھی نظر آتا ہے۔ لہٰذا، طاقتور قوتوں کے زیرِاثر تشکیل پانے والی تاریخ کے تضادات کا، کسی دوسرے تاریخی متن، جو کہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہو، کے تحت مطالعہ کیا جاتا ہے۔ نو تاریخیت ادبی فن پارے میں بھی انہیں تضادات کو نمایاں کرنے پر زور دیتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ دراصّل نو تاریخیت کسی دور کی تاریخ میں پوشیدہ اصل حقائق کو اسی دور کی ثقافت، سیاست اور سماجی تبدیلیوں کے تحت پرکھتی ہے۔ لیکن تاریخیت جو کہ ادب پر تاریخ کو برتر مانتی ہے، اس کے برعکس نو تاریخیت ادب اور تاریخ کو مساوی بنیادوں پر فن پارے کی تفہیم میں ساتھ لے کر چلتی ہے۔ لیکن ان دونوں کے پیشِ نظر بیانِ تاریخ کی جانچ پرکھ ہی ملحوظِ خاطر رہتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق نو تاریخیت، تاریخیت کی طرح ادب کی تفہیم میں جبری صورت اختیار نہیں کرتی، یعنی زبردستی ادب کو تاریخ کے زیرِ اثر نہیں رکھتی بلکہ یہ تاریخ کے عدم تسلسل کو اجاگر کرتی ہے۔ جو تفہیمی عمل میں طاقت کا اثر قبول نہیں کرتی۔ غرض تاریخیت اور نو تاریخیت دونوں کے پیشِ نظر تاریخ کا بیان ہی ہے۔ لیکن ان دونوں کا ادبی فن پارے کی تفہیم کے طریقہء کار اور ترجیحات میں فرق ہے۔

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

قرۃ العین حیدر کو اردو ناول نگاری میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے ناولوں میں تہذیبی و تاریخی شعور اور فلسفیانہ اندازِ بیان انھیں اردو ناول نگاری میں منفرد مقام پر فائض کرتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں تصورِ وقت اور تاریخ جیسے موضوعات اور فلسفے پر خاصی گرفت نظر آتی ہے۔ اردو ناول نگاری میں ان کی خاص پہچان ان کا ناول 'آگ کا دریا' ہے۔ جو ہندوستان کی پچیس سو سالہ تاریخ پر مشتمل ہے۔ اس ناول کے بعد وہ ایک تاریخ دان سمجھی جانے لگیں۔ جس کی تاریخ پر گرفت انتہائی مضبوط تھی۔ ان کے ناولوں میں جہاں ہندوستان کی قدیم وجدید تہذیب، مختلف مذاہب اور قوموں سے تعلق رکھنے والے کردار، عالمی جنگیں، تقسیم ہند، ہجرت کے واقعات اور سیاسی کشمکش نظر آتی ہے، وہیں ان کے ناولوں میں رومانویت، وقت کی جبریت، سماجی و سیاسی کشمکش سے نبرد آزما ہوتا نوجوان طبقہ، عورت کا مضبوط کردار اور تہذیبی بکھراؤ میں اپنی جڑوں کی تلاش کا عمل بھی نظر آتا ہے۔

ناول 'آخرِ شب کے ہمسفر' ۱۹۷۹ء میں لکھا گیا۔ جب پاکستان دو حصّوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس ناول میں واقعات کا زمانہ بیسویں صدی کے آغاز سے نظر آتا ہے۔ جب تقسیمِ بنگال ۱۹۰۵ء ہو کر ۱۹۱۱ء میں منسوخ بھی ہو گئی تھی۔ اس ناول کی کہانی بھی بنگال میں کلکتہ اور بنگلہ دیش میں ڈھاکہ کی سیاسی وانقلابی تحریکوں کا محور ہے۔ قیامِ پاکستان کے مطالبے سے لے کر تقسیمِ ہندوستان اور ہجرت کے واقعات اور پھر سقوطِ ڈھاکہ اس ناول کا موضوع ہے۔ اس ناول میں نوجوان طبقہ کی مختلف سیاسی تحریکوں کا ذکر بھی ہے۔ جو انگریزوں سے آزادی کے لیے کوشاں تھے۔ اس ضمن میں ناول کے دو مرکزی کردار دیپالی سرکار اور ریحان الدین احمد ہیں اور ان کے ساتھ اومارائے ہے۔ جو بنگال کی سیاسی تحریک کے متحرک کرداروں کے طور پر نظر آتے ہیں، جن کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے ہے۔ اس کے علاوہ نواب قمر الزماں چوہدری، ڈاکٹر نبوئے چندر سرکار اور یورنڈ پال متھیو بنرجی ناول میں ضمنی کردار ہیں۔ جو انگریز، مسلمان اور ہندو سیاسی سوچ کے عکاس نظر آتے ہیں۔ ناول کے نو تاریخی مطالعہ کے لیے ثقافت اور سیاست دو ایسے عناصر ہیں جن کے تحت ناول میں مضمر بیانیوں کو تہہ در تہہ سلسلوں سے نکال کر نمایاں کیا جاتا ہے۔ لہٰذا، ثقافت اور سیاست کے تحت ناول کا مطالعہ نو تاریخیت کے تناظر میں کیا جاسکتا ہے۔

نو تاریخیت کے تحت اس ناول میں سیاست اور سماج پر سیاسی و ثقافتی اثرات کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس ناول میں ثقافت کے اظہار کے ساتھ ساتھ مذہبی اور علاقائی بیان میں بھی شامل ہیں۔ یہ ناول لکھا تو ۱۹۷۹ء میں گیا لیکن اس کی کہانی نو آبادیات کے دور کی کہانی ہے۔ جب انگریز نو آبادکار کے طور پر ہندوستان کا حاکم بنا بیٹھا تھا۔ یہ ناول

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

سیاسی و تاریخی شعور کے علاوہ اس دور کے محکوم ہندوستانیوں بالخصوص بنگال کے لوگوں کی انگریز مخالف تحریکوں اور نو آبادکار کے خلاف غم و غصّے کا اظہار یہ بھی ہے۔نہ صرف انگریز کے خلاف لوگوں کے جذبات کو مصنفہ نے اس ناول میں بیان کیا ہے بلکہ اپنے کرداروں کے ذریعے انگریز کی منافقانہ روِشوں اور یہاں کے لوگوں کے مذہبی، معاشی اور سیاسی استحصال کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے۔ انگریزوں کے پس پردہ مفادات اور ان مفادات کے حصّول کت طریقہ ءکاروں کا بھی پردہ فاش کیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کے انگریز نے ہندوستانیوں پر بہت ظلم ڈھائے یا ان کے ساتھ ناانصافی کی بلکہ خود ہندوستانی کس طرح انگریز کے آلہ کار بنے اور اپنے ہی لوگوں سے اپنے مفادات کی خاطر غداری کی۔ مصنفہ اس بیانیے کو بھی چھپانے کی بجائے عیاں کرتی نظر آتی ہیں۔

> "بہت عرصے سے قحط نہیں پڑا تھا اور ہندو تجدیدیت اور مسلم تجدیدیت نے الگ اودھم مچا رکھی تھی۔ مسلمان تو خیریوں بھی شاذونادر ہی عیسائی ہوتے تھے۔ یہ بھی بڑی ہٹیلی اور خود پسند قوم ہے۔"(۲)

یہاں مصنفہ نے ان ہندوستانیوں کے لئے میتھیو بنرجی کو نمائندے کے طور پر اجاگر کیا ہے۔جو اپنے مفادات کی خاطر اپنا مذہب چھوڑ کر ہندو سے عیسائی ہو گئے۔یہ لوگ انگریزوں کے مفادات کے حصّول میں معاون و مددگار تھے۔ منموہن بنرجی ابریورنڈ پال میتھیو بنرجی تھے اور ان جیسے اور کتنے ہی لوگ تھے،جنھوں نے بنگال کے قحط میں، جو کہ انگریزوں کے معاشی استحصال کا نتیجہ تھا، اس سے نجات پانے کی خاطر عیسائیت کو قبول کیا۔ اور اس کا پرچار بھی کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ جن لوگوں کو ہندوستانی معاشرے میں اچھوت سمجھا جاتا تھا اور تعلیم سے بھی یہ طبقہ محروم تھا۔وہ عیسائیت اختیار کر کے تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ بن گئے۔ یعنی انگریز پہلے قحط کا سامان پیدا کرتا تھا۔ پھر اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر دیسی عیسائی مبلغین کے ذریعے اپنے مفادات، مذہبی اور معاشی طور پر پورے کرتے تھے۔ناول میں بھی ایک جگہ اس کی وجہ موجود ہے کہ برطانیہ کی اقتصادی بالادستی کی وجہ سے ملک میں قحط پڑتا تھا اور بیروزگاری بڑھ جاتی تھی۔ تو مشنری قحط کے مارے ہندوستانیوں کو عیسائی بنا لیتے تھے۔

یہ ناول ایک نو تاریخی حیثیت کا حامل نظر آتا ہے کیونکہ اس میں اسباب و علل اور نتائج کو کھل کر پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں جب مشنریوں نے مذہبی لٹریچر شائع کرنے شروع کیے تو فورٹ ولیم کالج میں انہیں سنسر کر دیا گیا اور اس لٹریچر کے باعث ہندوؤں میں اشتعال انگیزی پھیل گئی۔اس صورتِ حال کو جب سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر مارش مین کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس کے کلمات کچھ یوں تھے کہ

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

"ہندوستانی انتہائی کمزور اور اہم کردار کا مالک ہے اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا۔ اور اس کے اس بودے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیرِ سایہ زندہ رہنا اس کے لیے برکت الٰہی کا موجب ہے۔"(۳)

اس کے پس پردہ جو عنصر کار فرما ہے؛ وہ انگریز کی نو آبادیاتی تشکیل کے وقت بھی تھا۔یعنی ہندوستانی جہالت کا منبع ہیں اور ہم انہیں تہذیب یافتہ قوم بنائیں گے ۔ اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس مشنری کے ہندوستان پر مغلیہ حکومت اور افغانیوں کے حملوں اور حکومتوں کی اجارہ داریوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ قوم ہمیشہ سے مختلف قوموں کی محکوم رہی ہے اور اس میں ایک اور نقطہ یہ بھی تھا۔ وہ یہ کہ جو ہندو یا مسلمان عیسائی ہو جائے گا وہی اپنے تحفظ کا ذمہ دار اور حکومت برطانیہ کا وفادار تصّور کیا جائے گا۔ کیونکہ انگریز کے انہیں ہتھکنڈوں پر ان کی حکومت کی سلامتی اور توسیع کا انحصار تھا۔

جس طرح اس بیانیے کو تاریخ کا اٹوٹ حصّہ بنا دیا گیا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے غداری کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔اس ناول میں ایک اور بیانیہ بھی ملتا ہے۔ جہاں بنگال کی سیاسی تحریکوں میں مسلمان رہنما ریحان الدین احمد خود تو روپوش رہتا ہے۔ مگر اپنے ہندو اور مسلمان کارکنوں سے ہر طرح کے مفاد حاصل کرتا ہے۔ دیپالی سرکار تحریک کی مالی امداد کے لیے اپنی خاندانی بالوچر ساڑھیاں چوری کر کے بیچ دیتی ہے۔ باقی کے کارکنان یا تو انگریز اہلکاروں کے ہاتھوں پکڑے جاتی ہیں یا قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ تحریک کے لئے اکٹھی ہونے والی مالی امداد سے ریحان الدین احمد بھی اپنا گزر بسر کرتا اور روپوش رہتا۔ اور آخر میں اپنی تحریک کا ساتھ چھوڑ کر اپنے ذاتی مفادات کے لیے تقسیم کے بعد حکومت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اپنے کارکنان اور دوستوں کو پہچاننے سے انکاری ہے۔ اپنے کارکنوں سے ہر طرح کا مفاد حاصل کرتا ہے۔ مگر آخر میں انہیں اکیلا چھوڑ جاتا ہے ۔ کیمونسٹ تحریک کے بنگالی کارکنان پر جب انگریزوں کی جانب سے ظلم و ستم کا آغاز ہوا۔ کارکنوں کو گولیاں ماری گئیں ۔ فوجداری مقدمے چلائے گئے ۔ حوالات میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جلوسوں پر اشک آور گیس چھوڑی گئی، تو ان کا لیڈر ریحان الدین احمد ان کا ساتھ چھوڑ گیا۔ ریحان الدین احمد ان رہنماؤں کے لیے علامت کے طور پر کردار کی صورت نظر آتا ہے، جنھیں حقیقی انقلاب سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنے مقصد کو دولت اور کرسی کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے لیڈر کی اس غداری کے بعد باقی کے کارکنان دیپالی، روزی اور اوما رائے بھی انقلاب کی باتوں سے اکتا کر رفتہ رفتہ اسی ماحول میں خود کو ڈھال لیتے ہیں، جس کے خلاف پہلے وہ سرگرمِ عمل تھے۔ دیپالی جو کہ

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

اپنے چچا دینش چندر سرکار جو کہ انقلابی لیڈر تھے اور اس پاداش میں انھیں پھانسی دے دی گئی، یہ وہی دیپالی سرکار تھی جو اپنے چچا اور ان کے ہزاروں حامیوں کے خون کو رائیگاں جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہی دیپالی اب اپنی روِش سے ہٹ چکی تھی۔ اتنا ہی نہیں ریحان الدین احمد بعد میں اپنے بیٹے کو جو کہ انقلابی خیالات رکھتا ہے۔ اس سے ہمیشہ خفا رہتا ہے کہ یہ کس راستے پر چل نکلا ہے۔ ریحان الدین احمد پر دیپالی ایک جگہ طنزیہ جملہ کہتی ہے کہ کل کے باغی آج کے اسٹیبلشمنٹ میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہ دراصل ان کے انقلابی آدرشوں کا زوال تھا۔

ناول میں ہندو مسلم اختلافات کا بیان بھی موجود ہے۔ نواب قمر الزماں چوہدری جو کہ مسلم لیگ کے اہم رکن ور ہنما ہیں۔ ان کی اور دیپالی کی گفتگو ناول میں دراصّل ہندو مسلم اختلافات کی نمائندہ ہے۔ دیپالی ہندو نظریے اور نواب قمر الزماں چوہدری مسلم نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔ نواب قمر الزماں کے مطابق تقسیم بنگال میں بنگالیوں کا اقتصادی فائدہ تھا اور وہ اس کے حامی تھے۔ جبکہ نوجوانوں کی کمیونسٹ اور دوسری انقلابی تحریکوں نے اپنے متشدد رویوں کے باعث حکومت کے اس فیصلے کو واپس لینے پر مجبور کر دیا اور جن لوگوں نے انگریزوں کا قتل کیا۔ اسمبلیوں پر بم پھینکے وہ نوجوانوں کے ہیرو قرار پائے۔ یہ اشارہ بھگت سنگھ کی طرف ہے جس نے مرکزی اسمبلی پر بم پھینکا تھ۔ اسے پھانسی دے دی گئی تھی۔ اس طرح کے کئی واقعات نے انگریزوں کے مسلمانوں اور ہندوؤں پر ظلم و ستم کو بڑھاوا دیا۔

دیپالی سرکار ہندوؤں کے متحدہ ہندوستان کے نظریے کی حامی ہے اور وہ نواب قمر الزماں سے درخواست کرتی ہے کہ ملک کو تقسیم نہ ہونے دیں۔ مسلم لیگ کو اس مطالبے سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ گوتم بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی اور نہرو نے قومی جدوجہد میں بہت سی قربانیاں دی ہیں۔

> "دیپالی نے اب ذرا غیر یقینی لہجے میں کہا۔" کہ بٹوارے کے بجائے اتحاد کی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔"(۴)

اب یہاں نواب قمر الزماں چوہدری نے دیپالی سے پوچھا کہ وہ کس اتحاد کی بات کر رہی ہے؟ کیا پنجاب کا آریہ سماج مہاراشٹر اور بنگال کی ہندو تجدید پرستی اتحاد کی نشانی ہے؟ دیپالی کا یہ ماننا تھا کہ بنگال میں ہندو اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔ پھر ملک کی تقسیم کیوں کر ہو؟ اس کے جواب میں نواب قمر الزماں نے جو جواب دیا۔ وہ اس بیانیے کی مکمل توثیق ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک رکھا گیا تھا۔

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

"مانتا ہوں بھائی۔۔۔ یہاں کا کلچر ایک ہے۔ یہاں کی لوک سنگیت 'لوک ساہتیہ' ہر چیز میں مسلمانوں کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ مگر ہندوؤں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے ان کی مراد محض ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں تو زور شور سے یہ بحث چھیڑی گئی تھی کہ بنگلہ مسلمانوں کی زبان ہے ہی نہیں۔ بنگلہ ادب اور تہذیب صرف ہندوؤں کا ورثہ ہے۔ کیا ہم اتحاد نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحاد چاہتے تھے۔۔۔"(۵)

یہ بیانیہ ایک مسلم لیگی رہنما کے بیانیے کے طور پر نظر آرہا ہے۔ مگر اس میں حقیقت پنہاں ہے۔ ہندوستان میں صحیح معنوں میں یہ سب مسلمانوں کے ساتھ ہوتا رہا تھا۔ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے بھی مسلمان ہندوستان کی آزادی کے قائل تھے۔ مگر جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں انگریزوں نے مذہب اور کلچر کی پھوٹ پیدا کر دی تو مسلمانوں سے ہندوؤں کا ناروا سلوک شروع ہو گیا۔ قائد اعظم خود کانگریس میں ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ مگر یہاں صرف بنگال کے مسلمانوں کی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے۔ جو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی حالتِ زار کی طرف اشارہ ہے۔ ہندی اردو تنازعہ، شدھی اور سنگھٹن کی تحریک، تحریک خلافت کی ناکامی، مسلمانوں کی حکومتی امور میں شرکت کو ممنوع سمجھنا، یہ تمام حالات و واقعات ہیں جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستانی ثقافت کا حصہ سمجھا ہی نہیں گیا۔ ہندوستان کی ثقافت اور کلچر کو صرف ہندوؤں سے مخصوص کر دیا گیا۔ جبکہ ہزار ہا سال سے مسلمان یہاں آباد تھے اور اسی ثقافت اور کلچر کے نمائندہ بھی۔ لیکن سکے کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ وہ یہ کہ ایک اور چیز جو اس ناول میں نظر آتی ہے؛ وہ مختلف سیاسی و مذہبی تحریکوں کی معاشرے اور افراد پر اثر پذیری ہے۔ انگریزوں نے جہاں ہندوؤں کو عیسائی کرنے کی تحریکوں کا آغاز کر رکھا تھا کیونکہ مسلمان تو اس اثر میں آ ہی نہیں رہے تھے۔ وہیں انگریزوں نے مسلمانوں میں فرقہ پرستی کی پھوٹ ڈال دی تھی۔

"سندربن میں اسے ریحان نے ایک شام وہابی تحریک کے متعلق بتایا تھا۔ جس کی زیرِ قیادت مسلمان مولوی انیسویں صدی میں بنگالی مسلمان کسانوں سے کہتے پھرتے تھے کہ وہ اپنے ہندوانہ رسم و رواج ترک کر دیں۔ اور پھر لڑوا دیا انگریزوں نے آپس میں۔"(۶)

یعنی مسلمانوں میں فرقہ واریت کا بیج تو بو دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کلچر سے بھی مسلمانوں کو متنفر کیا گیا۔ جس میں مسلمان مولوی حضرات پیش پیش تھے۔ یعنی یہاں تصویر کے دونوں رخ دکھائے گئے ہیں کہ صرف ہندو ہی مسلمانوں کو ہندو کلچر سے خارج نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ بہت سے مسلمان بھی تھے جو خود یہ کلچر چھوڑنے کے

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

متمنی تھے۔ ہر معاملے میں محرکات دونوں طرف سے کار فرما ہوتے ہیں۔ جو تاریخ کے متضاد رویوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اور اصّل سچ قاری تک نہیں پہنچ پاتا۔ نو تاریخیت اسی سچ کو سامنے لاتی ہے۔ فرقہ پرستی کے پیش نظر یہ بات تاریخ کا حصّہ ہے کہ انگریزوں کی ہندوستان آمد کے بعد مسلم فرقہ واریت اور خاص کر وہابیت کو بہت فروغ ملا۔ جس نے مذہب اور سماج میں بہت سے مسائل کو جنم دیا۔ اس ناول میں مذہبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی، وہ تمام عوامل غیر جانبداری سے بیان کیے گئے ہیں، جو اس تاریخی واقعے تقسیم ہند اور سقاطِ ڈھاکہ کا سبب بننے تھے۔ اس کے علاوہ غدر پارٹی (۱۹۱۵ء) کے قیام، ٹرررسٹ تحریک، فرائضی تحریک اور عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی اور دیگر سیاسی تحریکوں کا مختصر احوال بھی درج ہے۔ جن کے نتیجے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں جیسا کہ چاٹگام، جلال آباد، ضلع مدناپور وغیرہ میں نوجوانوں کی طرف سے انگریز عہدیداروں اور اہلکاروں کے قتل کیے گئے۔ یو-پی میں سرکاری خزانہ لوٹا گیا۔ جس کی پاداش میں پکڑے جانے والوں کو سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ سردار بھگت سنگھ کا ذکر بھی اسی ضمن میں کیا گیا ہے، جسے پھانسی دی گئی تھی۔ ان تمام واقعات کی وقوع پذیری میں ہندو، مسلمان، سکھ، بنگالی، مدراسی سبھی شامل تھے۔ اور بیک وقت تمام عوامل کے نتائج کے طور پر تقسیمِ ہند کا واقعہ رونما ہوا۔

اس ناول میں سیاسی و سماجی احوال کے ساتھ ساتھ ثقافتی منظر نامہ بھی موجود ہے۔ ناول کا آغاز ہی گھروں کے تعمیری نقشے کی خاص انداز میں منظر نگاری سے ہوتا ہے۔ مابعد جدیدیت میں عمارتوں کے تعمیری نقشوں کو آرکیٹیکٹ کے فن میں خاصی اہمیت حاصّل ہے۔ اس ناول میں چندر کنج کا نقشہ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں پرانی وضع کی سفید کوٹھی کی تصویر کشی میں باشا کی مضبوط چٹائیوں، چلمچی کے اسٹینڈ، ٹین کے کنستر کے ٹکڑے، میز پر کاسنی کے غلاف سے ڈھکے ہارمونیم اور ایسراج کے ساتھ ساتھ دیوار پر آویزاں مرد اور عورت کے پورٹریٹ کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ نو آبادیاتی نظام کے اثرات، مغربی وکٹورین طرز آرائش کا ذکر بھی اومارائے کے گھر کی منظر نگاری کی نسبت سے بیان کیا ہے۔ بنگالی ثقافت اور رسم ورواج کا ذکر بھی یہاں مذہبی حوالے سے ملتا ہے۔ جس میں دیپالی کے گھر میں بنے ہوئے چھوٹے سے مندر اور مورتیوں پر گیندے کے تازہ پھلوں کے ہاروں کا ذکر ملتا ہے۔ ثقافتی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ہندو مذہب کے کلچر کو بنگالی ہندوؤں کے پیرائے میں دکھایا گیا ہے۔ یہاں پر ساڑھیوں کو محفوظ رکھنے کا بھی ایک خاص طریقہ ہے کہ ساڑھیاں نیم کے پتوں کی تہہ میں رکھی جاتی ہیں۔ ان ساڑھیوں کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ دیپالی سرکار کی خاندانی بالوچر ساڑھیاں ہیں۔ جو مرشد آباد سے بن کر آئی تھیں۔ یہ کاسنی، نارنجی اور فیروزی رنگ کی ساڑھیاں تھیں۔ جن پر کڑھائی سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

"کاسنی ساری سب سے بیش قیمت تھی۔ اس کے آنچل پر ایک قطار میں مرشد آباد کے نواب پیچوان نوش کر رہے تھے۔ نارنجی ساری کے پلو پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ناؤ میں بیٹھے تھے۔ فیروزی ساری کے آنچل پر مغل بیگمات ہاتھی کے ہودے پر بیٹھی گلاب کا پھول سونگھنے میں مصروف تھیں۔(۷)

یہاں مصنفہ نے علامتی انداز اختیار کیا ہے۔ ہندوستان کے حکمرانوں کی حالتِ زار اور غیر قوم کی یہاں آمد کو علامتی انداز میں بیان کر رہی ہیں۔ کاسنی ساڑھی کے آنچل پر مرشد آباد کے نوابوں کا پیچوان نوش کرنا علامت ہے ان مغل حکمرانوں کے لیے، جو اپنی سستی و کاہلی اور عیاش پسند طبیعت کے باعث حالات اور سیاست سے بے بہرہ تھے۔ نارنجی ساڑھی پر بنے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز جو ناؤ پر سوار ہیں، علامت ہے کہ مغل حکمران اپنے آپ میں مگن رہے اور ادھر انگریز سمندر پار کر کے آئے اور ہم پر حکمران بن بیٹھے۔ فیروزی ساڑھی، جس میں مغل بیگمات ہاتھی کے ہودے پر بیٹھی گلاب کا پھول سونگھنے میں مصروف ہیں، دراصّل مغل عورتوں کی گلاب جیسی نازکی سے تشبیہ ہے کہ انہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کوئی غیر ان کی سرزمین پر قبضہ کر رہا ہے۔ مرد، عورت، حکمران سب بے عملی کا شکار تھے۔ یہ علامت اس لیے واضح کی گئی ہے کہ اس ناول میں عورتوں کو کافی متحرک دکھایا گیا ہے۔ یعنی نئی نسل کی حب الوطنی اور غیرت کو اجاگر کیا ہے۔ دیپالی سرکار، اومارائے اور روزی اس ناول میں سیاسی حوالے سے خاصے متحرک نسوانی کردار ہیں۔

گیت کسی بھی علاقے کی خاص ثقافت کا حصّہ ہوتے ہیں۔ اور ہندوستان کی ثقافت ان گیتوں کے بغیر ادھوری ہے۔ ناول میں دیپالی کو ایک گائیکہ کے کردار میں بھی دکھایا گیا ہے۔ جو ریڈیو پر اپنی بنگالی ثقافت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے گیتوں کے ایچ ایم وی ریکارڈ بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ پدما کے ماجھی کا گیت، جوار بھاٹا کا نغم، ہ عباس الدین احمد کی امر سنگیت، بھٹیالی اور جہاں آرا کی شادی کے موقع پر پالکی والوں کے گیتوں کا ذکر یہاں ہندوستانی ثقافت کا نمائندہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی ایک تھیٹر کمپنیوں کا ذکر بھی یہاں کیا گیا ہے۔ جہاں ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ پھر بنگال ناٹک کمپنیوں کے حوالے سے بہت مشہور بھی رہا ہے۔ یہ بنگالی تھیٹر کمپنیاں تاریخی، سوشل اور سیاسی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ شاعری کے ورثہ میں شیخ مدن باؤل، شنتولن شاہ، حسن رضا اور رولن شاہ ہیں۔ جنھوں نے شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا۔ اسے بنگالیوں کا مشترکہ ور ثہ سمجھا گیا۔ ناول میں ہی ذکر کیا گیا ہے کہ ڈھاکہ میں اردو تھیٹر ۱۸۵۷ء میں شروع ہوا اور شہر میں ۳۴ تھیٹر کمپنیاں قائم کی گئیں۔ اور یہاں کے نواب خود بھی ناٹک

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

لکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ ناول میں نوابزادہ فخر الزماں مرحوم کے 'راجہ بھوج' ناٹک کا ذکر ہے۔ جو کہ بنگلہ زبان میں تصنیف کیا گیا۔ یہ صورتِ حال بنگالیوں کی تفریح اور کلچر میں آنے والی نئی تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن نو آبادیاتی نظام کے تحت کلچر میں بھی دراڑیں پڑ گئیں اور اچھے وقتوں کی یادیں صرف ماضی کا حصہ بن گئیں،

> "ہمارے بنگال کی ڈھاکہ کی مسجدیں، قلعے، پرانے محلات، ہماری مصنوعات، ہماری سنگیت اور سنگتراشی، یہ سب اس سنہرے رومانی ماضی کی یادگار ہیں۔ لیکن اس ڈھاکے کے شہر کا موجودہ فرقہ وارانہ کھچاؤ اور افلاس برطانوی کولونیلزم کا ثبوت ہیں۔"(۸)

یہاں مصنفہ کا نقطہ ء نظر نو آبادیاتی نظام سے بغاوت کا اظہار ہے۔ جہاں اپنے ہی لوگ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار نظر آتے ہیں۔ ناول میں جابجا بنگال کی اقتصادیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں دو کتابوں 'بنگال کی اقتصادی تاریخ' جو کہ دیپالی کے چچا دنیش چندر سرکار نے لکھی اور دوسری ریحان الدین احمد لکھنا چاہتا ہے۔ گس کا عنوان' انیسویں صدی میں بنگال کی زرعی حالت'۔ ناول میں بنگال کی اقتصادیات اور قحط کا بار بار ذکر دراصّل ہندوستانیوں کی حالت کا نوحہ ہے۔ جو برطانوی نو آبادیاتی نظام کا نتیجہ ہے۔ مصنفہ نے یہاں اپنا متحدہ ہندوستان کی حمایت میں نقطہ ء نظر پیش کیا ہے۔ جہاں وہ برطانوی حکومت کو جنگل کا قانون قرار دیتے ہوئے، ایک دکان سے تشبیہ دیتی ہیں۔ جس کے سامنے ہندوستانی مختلف فرقے، قطار میں کھڑے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اپنی وفاداری کا ثبوت دے کر اپنا کشکول بھر سکیں۔ اور ایسا ہوا بھی جہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کر اپنی ترقی کی راہیں ہموار کیں۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے، اس کے پس منظر میں مصنفہ کا ہندو مسلم اتحاد کا نظریہ موجود ہے۔ گو کہ یہ ناول ۱۹۷۹ء میں لکھا گیا، مگر مصنفہ کا پاکستان آکر واپس ہندوستان چلے جانا اور پھر اس ناول میں جابجا ملک کو نہ ٹوٹنے دینے کی درخواست دیپالی سرکار کے ذریعے کہلوانا، پھر یہاں کی عوام پر طنز کہ کیوں آپس میں لڑ جھگڑ کر ملک کی قسمت کا فیصلہ کروا رہے ہیں۔ دراصل اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ مصنفہ کے نزدیک ہندوستان کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے تھی۔

ہندوستان کی تقسیم کے وقت جو حالات واقعات تھے ان کا ذکر اتنا واضح نہیں ہے اور نہ ہی مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کا ذکر آغاز اور ارتقاء کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ دیپالی جب ڈھاکہ ارجمند منزل پہنچی، تو اسے یہاں کی صورتِ حال کا معلوم ہوا کہ ارجمند منزل کے تمام رہائشی قتل کیے جا چکے ہیں۔ کیونکہ یہ گھرانہ شیخ مجیب الرحمان کا حامی تھا۔ یہاں کے رہائشیوں میں صرف ریحان الدین احمد، اس کی بیوی، بیٹا اور چند ملازمین زندہ

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

بچے۔ کیونکہ اس وقت وہ شہر سے باہر تھے۔ ارجمند منزل کے ایک ایک فرد کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔ ریحان الدین احمد مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمان کی پارٹی 'عوامی لیگ' میں شامل ہو گیا۔ بنگال میں منسٹر کے عہدے پر بھی فائض رہا۔ پھر کلکتہ سے واپس ڈھاکہ چلا گیا۔ جہاں ان کی بھانجی ناصرہ نجم والسحر ریحان الدین احمد کے منافقانہ رویہ کا پردہ چاک کرتی ہے۔ ریحان الدین احمد کے مطابق

> "میں نے اس لڑکی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ انتہاپسندوں سے جا ملی تھی۔ بڑی آفت میں پھنستی۔ انتہا پسندوں کے گروہ سے الگ کروایا۔۔۔ میرے خلاف بکتی پھرتی ہے۔ نہ جانے یہ نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی احسان فراموش نئی نسل ہے۔"(۹)

یہاں اس بات کے پس پردہ دراصل ریحان الدین احمد کا ماضی بھی ہے کہ جب یہ سب کچھ وہ خود کرتا تھا۔ انقلاب کے نعرے لگاتا تھا اور تحریکوں کا حصّہ تھا۔ تب اس کے لیے یہ سب درست تھا۔ مگر اب اگر نئی نسل وقت اور حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر سیاست میں حصّہ لے رہی ہے، تو یہ اس کے نزدیک غلط ہے۔ کیونکہ ریحان الدین احمد مفاد پرست شخص واقع ہوا تھا۔ جس کے انقلاب کا نعرہ کھوکھلا تھا۔ جب دیپالی نے ریحان سے پوچھا کہ اس نے اتنے شرمناک سمجھوتے کیسے کیے۔ پہلے کلکتہ میں اپنے مفاد کی خاطر منسٹری میں جگہ بنائی۔ پھر ڈھاکہ میں مشرقی اور مغربی پاکستان کو توڑنے میں بھی اپنا پورا کردار ادا کیا۔ تو ریحان اس بات پر سوائے غصے کے اور کچھ نہ کر سکا ۔ دیپالی نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی علاحدگی پر بھی سوال اٹھایا۔

> "یہاں اتنی خونریزی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی بورژوازی کو نکال کر ایک نئی مقامی بورژوازی نے اس کی جگہ لے لی۔"(۱۰)

یہاں اس المیے کی طرف اشارہ ہے کہ جن وجوہات کی بناء پر مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علاحدہ کیا گیا۔ اور جو تحریکیں اس کا باعث بنیں، وہ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھی حکومت کے خلاف مقامی تحریکوں کی صورت میں پنپتی رہیں۔ یعنی جن وجوہات کی بنیاد پر ملک کو توڑا گیا۔ وہ وجوہات تو اب بھی موجود ہیں۔ اس کا فائدہ کیا ہوا؟ کیونکہ بنگلہ دیش میں اس وقت بہت سی سٹوڈنٹ یونینز حکومت کے خلاف تحریک چلا رہی تھیں۔ ناصرہ نجم السحر کو اس کا نمائندہ دکھایا گیا ہے۔ اسی لئے اس ساری صورتِ حال میں دیپالی نے ریحان کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اس ساری صورتِ حال کا ذمہ دار تھا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ شیخ مجیب الرحمن کی طرح کی سیاست کا عکاس

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہے۔ جو پہلے ہندوستان کی تقسیم اور آزادی کی تحریک کا حصّہ رہا اور بعد میں پاکستان کو توڑنے میں بھی مخالف تحریکوں کا سرگرم رکن اور رہنما رہا۔

ناول میں مصنفہ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے ٹوٹنے کی وجہ کی طرف بھی اشارہ کیا جو کہ کسی حد تک ٹھیک بھی ہے۔ یہ ناصرہ کے مطابق بنگالی، مغربی پاکستان کی زیادتیوں کے خلاف ہیں۔ مگر کٹر پاکستانی ہیں اور ہر حد تک جاسکتے ہیں۔ پاکستان کے لیے اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔ لیکن اب بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بھی جو اندرونی بغاوتیں پھوٹتی ہیں۔ ان میں پاکستان کی محبت دکھائی دے رہی ہے۔ بہت سے لوگ اس تقسیم کے خلاف نظر آتے ہیں۔ جن میں نوجوان سر فہرست تھے۔ لیکن وہ اپنی قوم کے ساتھ کی جانے والی ظلم وزیادتیوں کے بھی خلاف تھے۔ اگر تاریخ میں جھانکا جائے تو اردو زبان کو قومی زبان کا درجہ دینے پر بہت سے مسائل پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ بنگالیوں کو تو اردو زبان اس نہج پر نہیں آتی تھی کہ وہ گورنمنٹ میں نوکری حاصل کر سکیں یا بیوروکریسی میں اپنی خدمات انجام دے سکیں۔ یہ مسائل بڑھتے گئے اور اقتصادی و معاشی صورتِ حال نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور اختلافات کے نتیجے میں پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس ساری صورت ِحال میں جو قتل و غارت ہوئی ۔مصنفہ نے اس صورتِ حال کا تقابل کچھ اس طرح کیا ہے کہ ناصرہ دیپالی کو کہتی ہے کہ ہم لوگ آگ کے ایک بڑے طوفان سے ہو کر گزرے ہیں۔ اس کے مقابلے میں دیپالی کی نسل نے برطانوی حکومت کے خلاف جو جدوجہد کی اور اس دوران جو جانوں کا ضیاع ہوا وہ صرف خون ریزی کا ایک پکنک تھا۔ پھر وہ ریحان کے بیٹے فرقان سے کچھ اس طرح مخاطب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے نظریات کے خلاف ہے۔ ناصرہ کے مطابق اس نے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا۔ ملک میں مذہبی منافرت، اعتراضات ،بنگالی پنجابی نفرت ،بنگالی بہاری کی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈروں کے منافقانہ کردار دیکھے۔ اور یہ وہ وقت تھا جب ریحان جو ایک سیاسی رہنما تھا، کا بیٹا فرقان اپنے بات کے پیسے پر لندن میں مصروف عیش تھا۔ اس بیانیے کے پس پردہ ۱۹۷۱ء کی جنگ ہے۔ جس میں پاکستانی اور انڈین افواج کی ہتھیاری کشمکش میں بنگالیوں کا خون بہا۔ یہاں مشین گنوں کے استعمال کا ذکر بھی اس ضمن میں کیا گیا ہے کہ پاکستانی فوج کے جانے کے بعد عوامی لیگ کے کارکنوں اور دوسرے بنگالیوں کی جوابی کارروائی اور احتجاج نے مشرقی پاکستان میں خون کی ہولی کھیلی جانے کی منظر کشی کی ہے۔ اور سیاسی لیڈروں کے دوغلے پن مفاد پرستی اور مذہبی عنادیت نے اپنوں کو اپنوں سے لڑوا دیا۔ قوم پرستی کا کارڈ بھی کھیلا گیا۔ سیاسی رہنماؤں کے اپنے بچے تو بیرون

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

ملک تعلیم حاصل کرتے رہے اور مشرقی پاکستان کے عام نوجوان آزادی کے لیے خون بہاتے رہے۔ مندرجہ ذیل حوالہ جات اس صورتِ حال کا بیانیہ ہیں:۔

"لوگوں کو کس طرح مارا گیا؟ ان کو ہسپتال لے جاتے تھے وہاں پر کرسی سے باندھ کر ان کے جسم کا سارا خون نکال دیا جاتا تھا۔"(۱۱)

"لیکن جب یہاں کی ہزار ہا لڑکیاں ریپ ہوئیں۔ سنکڑوں کو مجبوراً طوائف بننا پڑا تو عالمِ اسلام کے کسی مولوی نے کچھ نہ کہا۔"(۱۳)

یعنی اس ساری صورتِ حال سے کوئی بھی محفوظ نہ رہا س۔ ۷۴ء کی ہجرت میں قتل وغارت کے بعد ۷۱ء کا یہ دوسرا واقعہ تھا جس نے انسانی درندگی کی ایک اور مثال قائم کر دی تھی۔

ناول 'آخرِ شب کے ہمسفر' میں نو تاریخی مطالعہ کے حوالے سے بیش بہا مواد موجود ہے۔ مصنفہ نے اپنے دور کے مختلف بیانیوں کو سیاسی حوالے سے بیان کیا ہے۔ جس میں نو آبادیاتی بغاوت، تقسیم ہندوستان کی حمایت اور مخالفت میں مختلف نظریات، ثقافتی نظریات اور نظریاتی کشمکش، برطانوی حکومت کے خلاف برسرپیکار انقلابیوں کی دلیلیں، کاروائیاں، پاکستان بننے کے بعد سقوطِ ڈھاکہ کے المیے اور اس کے مختلف سیاسی وسماجی نظریات کو غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے کسی ایک نظریے کی حمایت نہیں کی۔ جو تاریخ میں کسی بھی بڑے واقعہ جیسا کہ قیامِ پاکستان، سقوطِ ڈھاکہ وغیرہ کی شکل میں موجود رہے۔ بلکہ قراۃالعین حیدر نے اس ناول میں ایسے کردار پیش کئے ہیں، جو ہر نظریہ کی ردّ قبولیت سے ہم آہنگ ہیں اور اسی دور کی صورتِ حال کے مطابق دلیل سے بحث ومباحثہ کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مصنفہ نے کسی ایک نظریے میں وزن پیدا کرنے کی بجائے ان نظریات کے پسِ پردہ مختلف حقیقتوں کا انکشاف بھی کیا ہے۔ اور ہر بیانیہ کو اس کی اصل کے روبرو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ نو تاریخی مطالعہ کے حوالے سے ہر بیانیہ کے پسِ پردہ ہمیں وہی واقعات نظر آتے ہیں، جو کہ تاریخ میں اصل حالت میں موجود ہیں۔ بشرطیہ کہ وہ تاریخ بھی غیر جانبدار ہو۔ ثقافتی لحاظ سے بھی قرۃالعین حیدر نے ہندوستانی اور بنگالی، ہندو اور مسلم ثقافت کو ایک وحدت کی صورت میں دکھایا ہے، جو بعد میں اختلافات کی نذر ہو گئی۔ اور شاید انہیں اختلافات کی بنیاد بھی بنی۔ 'آخرِ شب کے ہمسفر' کے کردار کہیں نہ کہیں اصّل واقعات میں سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ناول تاریخی واقعات کی اصل پر مبنی ادبی فن پارہ ہے۔ جس میں کچھ معاملات کو ان کی اصّل میں پیش کیا گیا ہے۔ جو شاید تاریخ میں تضادات یا ابہام کے حامل ہیں۔ اس ناول میں

ISSN (**P**): 2709-9636 | ISSN (**O**): 2709-9644
Volume 4, Issue 4, (Oct to Dec 2023)
https://doi.org/10.47205/makhz.2023(4-IV)urdu-15

ماخذ تحقیقی مجلہ

ہندوستانی سیاست، ثقافت اور سماج کے ساتھ ساتھ ایک نظریاتی صورتِ حال کی انفرادیت بھی اُجاگر ہوئی ہے اور یہ اپنے مواد کی نوعیت کے اعتبار سے غیر جانبدار دکھائی دیتا ہے۔ جس میں تاریخی حوالوں کے پس پردہ اصلیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱- ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر، جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، انجمن ترقیٔ اردو، کراچی، پاکستان، اشاعت دوّم، ۲۰۱۳ء، ص ۲۴۶

۲- قراۃ العین حیدر، آخرِ شب کے ہمسفر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۲

۳- ایضاً، ص ۴۵

۴- ایضاً، ص ۱۲۴

۵- ایضاً، ص ۱۲۴

۶- ایضاً، ص ۱۲۵

۷- ایضاً، ص ۰۸

۸- ایضاً، ص ۱۲۰

۹- ایضاً، ص ۳۳۰

۱۰- ایضاً، ص ۳۳۶

۱۱- ایضاً، ص ۳۴۳

۱۲- ایضاً، ص ۳۴۳